R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

# ہماری زبان

تاریخ اشاعت [illegible]

[illegible]

جلد ۲۵ - شمارہ ۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم مارچ ۱۹۶۶ء

اداریہ

## صحت مند نظریہ کیا ہے؟

کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کا ذہن بھی مریض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت تاریک پہلو سامنے آتا ہے۔ ذرا سی مصیبت پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دل دھڑکنے لگے تو خیال ہوتا ہے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ ذرا سا شور کانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ خلاف مزاج ذرا سی بات ہو فوراً غصہ آ جاتا ہے۔ بیماری کچھ لمبی ہو جائے تو زندگی سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ غرض جسمانی مرض کے علاوہ ذہنی مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ جسمانی مرض تو جلد دور ہو سکتا ہے مگر ذہنی امراض دیر میں جاتے ہیں۔

تندرست آدمی کا رویّہ دوسرا ہوتا ہے۔ تکلیف ہوتی ہے ہنس کر ٹال جاتا ہے۔ مصیبت پڑتی ہے تو جد و جہد کر کے اُسے دُور کرتا ہے۔ حالات ناموافق ہوں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ کوئی بیماری ہو جائے تو مناسب علاج کرتا ہے مگر اس بیماری کی دھونس میں نہیں آتا۔ جسم تندرست ہوتا ہے تو ذہن بھی صحت مند ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی پر قنوطیت غالب نہیں آتی۔

قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ ہم ہندوستانی بڑے پرانے، بڑے شاندار، بڑے تاریخی ملک کے رہنے والے ہیں، مگر قوم کی حیثیت سے ہم نئے ہیں اور کچھ ذہنی امراض کے شکار ہیں۔ ہمارے سماج میں خرابیاں ہیں، ہمارے نظام میں بہت سی اصلاح طلب باتیں ہیں، مگر آج کسی جگہ جا بیٹھیے، خواص کا اجتماع ہو یا عوام کی ٹولی، سننے میں صرف بُرائیاں آئیں گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم ایک مرض میں گرفتار ہے۔ وہ ہے اعتراض کا مرض۔ اگر ان اعتراضوں کو جمع کیا جائے تو ان کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہم میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ مگر ہم صرف اپنی خوبیاں اور دوسرے کی خامیاں دیکھتے ہیں۔ حکومت نکمی ہے۔ وزیر ناکارہ ہیں۔ غذا کے معاملے میں کتنی نالائقی ہوئی ہے۔ رشوت کا بازار کتنا گرم ہے۔ سیاست داں کیسے بے ایمان ہیں۔ یونیورسٹیوں کی تعلیم کتنی ناقص ہے۔ پولیس کتنی جاہل اور ظالم ہے۔ طلبا کتنے بے راہ ہیں۔ افسر کتنے فرعون ہیں۔ مزدور کتنے سرکش ہیں۔ سرمایہ دار کس طرح خون چوس رہے ہیں۔ فلاں سیاسی پارٹی کتنی گمراہ ہے۔ اخبار کس طرح سنسنی پھیلاتے ہیں۔ عوام کس قدر غیر ذمہ دار ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب غلط ہے۔ ان باتوں میں صحت ہے مگر سچ صرف یہی نہیں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے جمہوریت کو اپنایا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے ترقی کی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے بعض دانش ور، بعض سائنس داں، بعض پروفیسر عالمی معیاروں پر پورے اُترتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے یہاں ایماندار آدمی بھی ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کا نقطۂ نظر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو دوسرے کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو خاموشی سے ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو فرض شناس ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن میں تعصب یا تنگ نظری نام کو نہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ماضی کے سرمائے کا احساس رکھتے ہوئے آگے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو سماج کی اونچ نیچ

## اس شمارے میں

کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایسے ادیب بھی ہیں جو انسانیت کے علمبردار ہیں اور قوم کا درد رکھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ہر زبان کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔

اس لیے ہمارا فرض ہے کہ آنکھ بند کرکے ہر بات پر اعتراض کرنا چھوڑ دیں۔ پہلے اپنی خامیوں پر نظر کریں اور دوسروں کی خوبیوں پر۔ پھر ہمیں حق ہوگا کہ اپنی خوبیوں پر اصرار کرتے ہوئے دوسروں کی خامیاں ظاہر کریں۔ اپنے فرائض کو ادا کرنے کے بعد ہی حقوق پر اصرار اچھا ہوتا ہے۔ حقوق پر اصرار اور فرائض سے چشم پوشی غلط ہے۔ پھر سب الزام حکومت یا اکثریت یا کسی سیاسی پارٹی یا روس یا امریکہ پر تھوپ دینا، یا ہر کمزوری کے لیے برطانوی سامراج کو مورد الزام ٹھہرانا فراریت ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔ ہم ہندوستانی نہ فرشتے ہیں نہ شیطان۔ ہم انسان ہیں اور انسانوں کی ساری خوبیاں اور ساری کمزوریاں ہم میں موجود ہیں۔ اگر خوبیوں کا احساس ہو جائے تو خامیوں کو دور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے مرض میں گرفتار ہیں یعنی انھیں سب ہندوستانی فرشتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے سب شیطان۔ یہ ایک ہی مرض کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسری قسم کی فراریت ہے۔

حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں اپنی طاقت کا بھی زیادہ گہرا احساس ہوگا اور اپنی کمزوری کا بھی۔ یعنی ایک مریض نقطۂ نظر کے بجائے ایک صحت مند نقطۂ نظر اپنانا ہوگا۔ اس صحت مند اور حقیقت پسند نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بعض باتوں سے ولولہ ملے گا، بعض باتیں پر عبرت ہوں گی، اور ہم فرد کو تہذیب نفس سکھا کر قوم کو ترقی کی منزل تک لے جا سکیں گے۔ جہاں یہ بات عام ہندوستانیوں کے متعلق صحیح ہے، وہاں اردو دوستوں کے متعلق خاص طور پر صحیح ہے۔ اردو زبان کے ساتھ حق تلفی ضرور ہوئی ہے، حکومت کی طرف سے بھی اور اکثریت کی طرف سے بھی۔ مگر اردو دوستوں نے سب سے زیادہ اپنی زبان کی حق تلفی کی ہے۔ ان کا نظریہ چند کو چھوڑ کر یہ ہے کہ ہمارا مستقبل تاریک ہے۔ حکومت بے پروا ہے اور اکثریت تنگ نظر اور ہم مجبور ہیں۔ حالانکہ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ آج نئے ہندوستان کے نقشے میں ہر گروہ اپنی بساط کے مطابق رنگ بھر رہا ہے۔ جو اپنا رنگ بھر رہا ہے اُسے کیا پڑی ہے کہ اپنا رنگ بھرنا چھوڑ کر آپ کا رنگ بھرنا شروع کر دے جب کہ غلطی سے وہ اس رنگ کو اپنا سمجھتا ہی نہیں۔ اب آپ کا فرض کیا ہے۔ اپنا رنگ خود بھریے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بتائیے کہ یہ صرف آپ کا رنگ نہیں سب کا رنگ ہے۔ اس طرح سے دوسرے بھی آپ کے کام میں شریک ہوں گے اس طرح ایک سے ایک لاکھ ہوں گے اور ایک لاکھ سے ایک کروڑ اور ایک کروڑ سے چینتالیس کروڑ۔ آج ہر شخص سماج کی اصلاح کے لیے سستا سا نسخہ لیے پھرتا ہے۔ فرد کی اصلاح کیجیے اور ان قدروں کو فرد کے ذہن پر ثبت کر دیجیے جو اچھے سماج کی قدریں ہیں دیکھیے سماج کی اصلاح کا عمل خود بخود شروع ہو جائے گا۔ اب وہ زمانہ لد گیا جب انقلاب کا نعرہ لگا کر لوگ فرض کر لیتے تھے کہ انقلاب کی آنچ خود بخود ذہنی اصلاح کر دے گی۔ ذہنی اصلاح کے بغیر خود انقلاب تاراج کا دوسرا نام ہوگا۔ ہمارا فرض جمہوریت کی روح کو پہچاننا، فرد کو جمہوریت کی ذمہ داریوں سے آشنا کرانا، اپنی اصلاح کرنا اور اپنے عمل سے دوسروں کو راہ راست پر لانا ہے۔ یہ راستہ لمبا ہے مگر لمبے راستے ہی بالآخر سب سے اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ ان پر چلنے والے منزل پر پہنچنے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔

---

## اختر انصاری صاحب کی دو نئی کتابیں

علی گڑھ ۔ ۲۲ر فروری۔ اردو کے ممتاز ادیب و شاعر جناب اختر انصاری دہلوی کی دو نئی کتابیں حال ہی میں فرینڈس بک ہاؤس شمشاد بلڈنگ علی گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب مطالعۂ تنقید موضوعات کے سولہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۲۱۰ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔ دوسری کتاب "پرچھائیں" میں اختر انصاری صاحب کے بہترین اور منتخب قطعات شامل ہیں ۱۱۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔

(نامہ نگار)

## پروفیسر احتشام حسین ہندوستانی اکیڈمی کے نائب صدر منتخب

الٰہ آباد۔ ۲۱ر فروری۔ کل یہاں سی۔ بی راؤ کی صدارت میں ہونے والی ہندوستانی اکیڈمی کی جنرل باڈی میٹنگ میں درج ذیل اشخاص کو اکیڈمی کا ممبر کو آپٹ کیا گیا۔ ڈاکٹر راجیشور راو اصغر (؟)، ڈاکٹر موہن سنگھ، ڈاکٹر کشتیر ناتھ، جگو ناتھ چترویدی (لکھنؤ)، ڈاکٹر وجیندر اسناتک (دہلی)، ڈاکٹر رتن شنکر مصرا (الٰہ آباد)، اور ڈاکٹر رام سنگھ تومر (شانتی نکیتن)۔ ڈاکٹر رام کمار ورما اور پروفیسر احتشام حسین کو اتفاق رائے سے اکیڈمی کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ میٹنگ نے درج ذیل کو اکیڈمی کی ایگزیکٹو کا ممبر منتخب کیا۔ ڈاکٹر نگیندر (دہلی)، ڈاکٹر ہربنس لال شرما (علی گڑھ)، ڈاکٹر بالکند گپتا (کانپور) اور موہن لال بھاٹیا (الٰہ آباد)۔ پنڈت سمترا نندن پنت سمیت گیارہ اشخاص کو اکیڈمی کی لائبریری مشاورتی کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔

(سیاست جدید)

## بیگم سیماب (اکبرآبادی) کا انتقال

کراچی بذریعہ تار ۔ ۲۱ر فروری ۶۶ء بروز دوشنبہ کراچی (پاکستان) میں بیگم صاحبہ علامہ سیماب اکبرآبادی (والدۂ ماجدہ حضرت اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" بمبئی) کا بیاسی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ انتقال کے وقت مرحومہ کے تین صاحبزادے ان کے پاس تھے۔

تاجدار احتشام
(نبیرۂ سیمابؒ)

نادم سیتاپوری

# بزمِ اکبر
## (ایک تنقیدی جائزہ)

اکبر الٰہ آبادی پر اب تک تھوڑا بہت جو لکھا گیا ہے اسے تحقیق کا درجہ بہر حال نہیں دیا جا سکتا۔ اکبر کی وفات (ستمبر ۱۹۲۱ء) کے بعد ایک چھوٹا سا رسالہ (کلام اکبر الٰہ آبادی) شفق عماد پوری نے لکھا تھا جس میں سوانح اکبر کا (غالباً) سب سے پہلا علمی خاکہ بھی تھا اس کے بعد مولوی قمر الدین احمد بدایونی کی "بزم اکبر" اور طالب الٰہ آبادی کی "حیات اکبر" دو کتابیں تقسیم ہند سے پہلے اور چھپیں جن کے بارے میں یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اولیت کا شرف کسے حاصل ہے کیونکہ "حیات اکبر" (طبع اوّل مطبوعہ مطبع انوار احمدی الٰہ آباد) سے سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

"بزم اکبر" (مولفہ مولوی قمر الدین احمد بدایونی) کے سرورق پر البتہ سن اشاعت ۱۹۴۰ء درج ہے اور یہ بھی کہ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شایع کی تھی۔ اور انجمن کے سلسلہ مطبوعات میں اس کا نمبر ۱۴۵ تھا۔

اس کے بعد ملا واحدی دہلوی کی مرتبہ "حیات اکبر" کا نام بھی سننے میں آیا جو بزم اکبر کراچی (پاکستان) نے شایع کی ہے لیکن اس کے مطالعہ سے تا حال محروم ہوں۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ اکبر کے فن اور شخصیت پر مضامین بکثرت لکھے گئے ہیں اور جہاں تک میرے محدود مطالعہ کا تعلق ہے اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی "علی گڑھ میگزین" کا وہ "اکبر نمبر" ہے جو ۱۹۵۰ء میں سید شبیہ الحسن نونہروی کے زیر ادارت نکلا تھا۔

مولوی قمر الدین احمد بدایونی کی "بزم اکبر" ان مستقل کتابوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر کتاب ہے جس کے متعلق یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ اسے سوانح کا درجہ دیا جا سکتا ہے یا مولانا بدایونی کی اس ذاتی ڈائری کی حیثیت حاصل ہے جس کے قلمبند کرنے کا خیال انھیں وفات اکبر (۹ ستمبر ۱۹۲۱ء) سے صرف دو سال قبل پیدا ہوا تھا اور اس کی نوعیت یہ تھی۔

"یہ یادداشتیں ایک زمانے تک غیر مرتب حالت میں پڑی رہیں، جب حالات نے کچھ موقع دیا تو ان کو ترتیب سے جا بجا بعض یادداشتوں میں تاریخ کا تعین نہ ہو سکا ان کو بغیر تاریخ کے تعین کے رکھنا پڑا ایسی یادداشتیں ڈائری کے اوراق کے باب میں ابتدا میں درج کر دی ہیں۔"

(صفحہ ۷۵۔ بزم اکبر)

"بزم اکبر" کو جن پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ باب اوّل۔ سوانح حیات۔
۲۔ باب دوم۔ مولف کتاب ہذا سے اکبر کے مراسم اور خطوط۔
۳۔ باب سوم۔ مولف کی ڈائری کے اوراق۔
۴۔ باب چہارم۔ مرض الموت اور انتقال۔
۵۔ باب پنجم۔ کلام پر تنقید۔

کتاب کی ضخامت (علاوہ سرورق) ۲۲۳ صفحات ہے اور پہلا اور پانچواں باب جس کا تعلق اکبر کی سیرت اور سوانح سے ہے صرف ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

"بزم اکبر" کے مطالعے کے بعد مطالعہ کار کے ذہن و شعور کو جن بنیادی تاثرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا مختصر سا تجزیہ اس طرح پر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مولانا بدایونی اکبر الٰہ آبادی کے خاص مقربین میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ان کے افتخار ہم نشینی و ہم کلامی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اکبر کی غلطیوں پر بلا تکلف انھیں ٹوک دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کی فنی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔ اور یہ کہ اکبر محض ایک صوفی منش حنفی ہی نہیں تھے بلکہ ان کے دل میں دوسرے فرقے کے خلاف ایک خاص قسم کا جذبۂ تعصب بھی تھا اور باوجودیکہ ان کے آبا و اجداد چشتی نظامی اور صاحبزادے عشرت حسین شیعی عقائد سے تعلق رکھتے تھے پھر بھی وہ شیعوں کے عقائد پر کھلی چوٹیں کیا کرتے تھے!

"بزم اکبر" میں سیرت و سوانح پر بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنا سطحی، نامکمل اور ناقص ہے کہ یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ مولانا بدایونی جیسا ذی علم جس نے قدم قدم پر اکبر کی شعری اور فنی رہنمائی کی تھی ان سامنے کی چیزوں سے اتنا بے خبر اور کم آگاہ ہوگا؟ مثلاً حسب و نسب کے تحت لکھا گیا ہے۔

"ضلع الٰہ آباد میں "بارہ" ایک مشہور قصبہ ہے سید حسین علی اور سید عبد اللہ جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اسی خاک نے پیدا کیے تھے۔ خان بہادر سید اکبر حسین الٰہ آبادی کا سلسلہ نسب اسی سرزمین کے خاندان سادات سے ملتا ہے ......."

(صفحہ ۱۵۔ بزم اکبر)

اکبر نسبی حیثیت سے "رضوی سید" تھے اور ان کا سلسلہ نسب ۵۶ واسطوں سے امام ہشتم حضرت امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ "ذاکر المعارف" کے حوالے سے سید بشیر حسین کانپوری لکھتے ہیں۔

"حضرت مولانا سید تفضل حسین صاحب کا شجرۂ نسبی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کے اجداد میں سید علی عرب معہ اپنے فرزند سید زید اور سید اپنے بھائی سید اسمٰعیل کے مقام گیٹ پور

ملک خراسان سے ۶۳۲ھ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور "تاریخ داؤدیہ" میں بعہد شہاب الدین محمد غوری ہندوستان تشریف لانا لکھا ہے اور یہ کہ آپ کے اولاد کی قرابت سادات بلگرام سے ہے ............... اکبر کا پورا نسب نامہ محفوظ ہے ان کا نسب ۲۵ واسطوں سے حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے اور حضرت امیر المومنین تک پہنچتا ہے۔"

(صفحہ ۹۰-۹۱ علی گڑھ میگزین اکبر نمبر)

مولانا بدایونی کو یہ تسامح شاید بارہ اور "بارہہ"[1] کی قدرے یکسانیت کی وجہ سے ہوا اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بارہ (ضلع الہ آباد) اور "بارہہ" (ضلع مظفر نگر) میں بلند شرفین ہے۔ سید حسین علی خاں اور سید عبد اللہ خاں "بادشاہ گر" جنھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بہت دنوں تک مغل بادشاہوں کو اپنی سیاسی شطرنج کا مہرہ بنایا تھا وہ "زیدی سید" تھے "زید شہید" کی اولاد سے! اور اکبر "رضوی النسل" ۔ بارہ (ضلع الہ آباد) میں اگر زیدی سادات کا کوئی خاندان ہو بھی تب بھی اکبر کا تعلق اس خاندان سے نہیں تھا۔ سید بشیر حسین کانپوری تحریر فرماتے ہیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ اکبر کو سادات بارہ (ضلع الہ آباد) سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کے حقیقی چچا سید وارث علی صاحب بڑے نامی گرامی تحصیلدار تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا تفضل حسین صاحب اپنی شروع زندگی میں اپنے بڑے بھائی (سید وارث علی) کے ساتھ رہتے تھے خود بھی کچھ دنوں تک نائب تحصیلداری کی تھی۔ اس زمانے میں سید وارث علی صاحب کا تقرر تحصیل بارہ (ضلع الہ آباد) میں تھا اور یہی سبب اس کا ہوا کہ اکبر "بارہ" میں پیدا ہوئے۔"

(صفحہ ۹۰۔ اکبر نمبر علی گڑھ میگزین)

ناموں کی یکسانیت سے اس قسم کے مغالطے کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں چنانچہ اکبر کے ایک خاص پرستار ڈاکٹر اعظم کریوی جو الہ آباد سے مدتوں ماہنامہ "اکبر" نکالتے رہے نام کی یکسانیت کی وجہ سے ایسی ہی ایک عظیم غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ اپنے مضمون "حضرت اکبر الہ آبادی" مطبوعہ مخزن لاہور دسمبر ۱۹۲۷ء) میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت اکبر کے والد سید تفضل حسین رضوی صوفی ابو العلائی۔ جن کو حضرت مولانا شاہ محمد قاسم داناپوری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل تھا بڑے جید عالم تھے ......."

(بحوالہ حیات اکبر مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد صفحہ ۲۸۷)

حقیقت یہ ہے کہ "اکبر" نام کے ایک اور بزرگ اسی زمانے میں الہ آباد میں رہا کرتے تھے۔ شاعر اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھیں وحید الہ آبادی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا جو اکبر الہ آبادی کے استاد تھے۔ ان کا خاندان "ابو العلائی" خاندان کا مرید بھی تھا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے ان کا ذکر اپنے ایک چھوٹے سے نوٹ میں کیا ہے۔

"صوبہ بہار کے ایک اور صاحب "محمد اکبر" تخلص نہ صرف شاعر تھے بلکہ اتفاق سے حضرت اکبر کے معاصر بھی تھے اور اتفاق مزید کہ شاگرد بھی انھیں کے استاد وحید الہ آبادی ہی کے تھے۔ بچپن سے ان کا قیام بھی الہ آباد ہی میں ہو گیا تھا۔ خاندان ابو العلائی (آگرہ) کے مرید بلکہ صاحب سجادہ بھی تھے۔ ان کے دو دیوان مطبوعہ "کلیات عشق" و "جذبات اکبر" کے نام سے موجود ہیں۔"

(ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ ۲۶ جون ۱۹۵۳ء جلد ۳ شمارہ ۳۰)

اکبر سے مولانا بدایونی کی پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور پھر "تعلقات" اتنے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے کہ بالآخر ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو —!

"اکبر نے مجھ سے فرمایا۔ میں نے آپ کے خاندان اور استعداد کا تذکرہ کل اپنی ہمشیرہ سے کیا تھا وہ کہنے لگیں کہ اگر "قمر الدین" اپنی شادی ہمارے خاندان میں کرنا چاہیں تو ہو سکتی ہے۔ راجہ میاں کی خوش شکل لڑکیاں موجود ہیں — میں نے عرض کیا ہم شیوخ صدیقی اب تک سادات سے نہیں ملے۔!

(صفحہ ۱۰۸۔ بزم اکبر)

یہ "راجہ میاں" کون تھے —؟ اس کی تشریح بھی مولانا بدایونی نے فرمائی ہے۔

"میز پر کھانا چنا گیا۔ سید صاحب (اکبر) کے بہنوئی "راجہ میاں صاحب" بھی شریک تھے۔"

(صفحہ ۲۱۱ بزم اکبر)

---

[1] "بارہہ" زیدی سادات کی ان بارہ بستیوں کا نام ہے جو ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کا نسبی تعلق انھیں "بادشاہ گر" سید حسین علی خاں اور سید عبد اللہ خاں سے ہے جن کا ذکر مولانا بدایونی نے کیا ہے۔

(ناظم سیتاپوری)

# غزلیں

**یوگندر پال صابر**

ہے عہدِ نو لیے پتھر بشکلِ دیوانہ
لرز رہا ہے ندامت کا آئینہ خانہ

بجائے دستِ کرم دیکھتے ہیں پیمانہ
بہوش باش دگرگوں ہے طورِ میخانہ

فقط وداعِ غلامی نہیں ہے آزادی
جو ہو سکے تو مٹا فطرتِ غلامانہ

جلائے شمع سے کہہ دو کہ مطمئن رہے
کہ اب اڑے گا ہواؤں میں بال پروانہ

سمجھ میں آئے حقیقت کی خامشی بھی اگر
سمجھ لیں آپ کہ کیا شے ہے شورِ افسانہ

ترے نثار تجھے کیوں گراں گزرتا ہے
بچھڑ کے تجھ سے اگر جی رہا ہے دیوانہ

بشر سمجھ ہی گیا آخر آدمی کا مقام
لرز رہا ہے حرم کانپتا ہے بتخانہ

خراب حالیٔ انساں کا غم نہ کر صابر
ہزار بار اجڑ کر بسا یہ کاشانہ

**سید حرمت الاکرام**

شہرِ مہتاب سے یہ کس کا پیام آتا ہے
دل دھڑکتا ہے تو دھڑکے ہی چلا جاتا ہے

سفرِ دل کا ہے ایک مرحلہ یہ بھی ورنہ
کون آغوش میں کانٹوں کے سکوں پاتا ہے

ڈال جاتا ہے کبھی راہ میں شعلے کبھی پھول
کون ہر گام پہ احساس سے ٹکراتا ہے؟

رات کس کس طرح پروان چڑھائی مگر
صبح ہوتی ہے تو ہر خواب بکھر جاتا ہے

مصلحت کون اس اندازِ جنوں کی سمجھے
تیرا دیوانہ تجھے بھول کے اتراتا ہے

کہیں شمعوں کی ضیا ہے کہیں روشن ہیں کنول
اور اندھیرا ہے کہ امڈا ہی چلا آتا ہے

اے گدائے درِ غم تجھ کو خبر ہو تو بتا
وقت کس طرح دبے پاؤں گزر جاتا ہے

کوئی عنوان اسے دے نہیں پاتا لیکن
خود زمانہ بھی کہانی مری دہراتا ہے

کیسے بتلاؤں کہ ویرانۂ دل میں حرمت
شمع سی کون سرِ شام جلا جاتا ہے

**نظر برنی**

پامالیٔ اربابِ وفا دیکھ رہا ہوں
بدلی ہے زمانے کی ہوا دیکھ رہا ہوں

غنچے نہیں کانٹے بھی ہیں مائل بہ تبسم
ہر پھول کو دستِ صبا دیکھ رہا ہوں

اندازِ کرم ان کا نہیں تازہ شگوفہ
اک عمر سے یہ کرب و بلا دیکھ رہا ہوں

آئی ہے مجھے یاد کسی ماہ لقا کی
برسات میں پھر زخم ہرا دیکھ رہا ہوں

ہے شمع کی آغوش میں پروانے کی تربت
افسوس یہ انجامِ وفا دیکھ رہا ہوں

**علی عباس امید**

کرے تو رقص گلستاں میں کیا بہار ابھی
کلی کلی ہے فسردہ و سوگوار ابھی

نہ کر سکے گا چراغاں خیالِ یار ابھی
تصورات بھی ہیں ذہن و دل پہ بار ابھی

وصالِ امید دل کے مسکنِ افسردہ کو
سلگ رہی ہے تمنا کی رہگزار ابھی

تمہارے عہدِ وفا کا یقیں تو ہے لیکن
خود اپنے دل پہ نہیں ہے مجھ کو اختیار ابھی

نہ کوئی آیا ہے اب تک نہ آئے گا امید
رگوں میں پھر بھی ہے لیکن اک انتظار ابھی

# نئے ادبی رجحانات

**دیویندر اسر**

آدرش کے فقدان، تہذیبی زوال، تنہائی کے احساس اور زندگی کے بے معنی ہونے کے تصور نے جدید ادب کو کافی متاثر کیا ہے۔ اور ادب میں نئے نئے رجحانات نے پرورش پائی ہے۔ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کا اصلی چہرہ کیا ہے؟ اسے تلاش کرنے اور قلم بند کرنے کے لیے نئے طرزِ فکر اور اسلوب کی ضرورت پڑی جو پرانے فنی لوازمات کے تحت ممکن نہیں۔ اس نئے احساس کو ڈراما کے شعبے میں اینٹی (ANTI ART) تھیٹر کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ ویسے تو کہانی اور ناول کے شعبے میں اینٹی اسٹوری اور اینٹی ناول کا رواج شروع ہو گیا ہے۔ ارسطو کے ڈرامائی قوانین کو یہ لوگ تسلیم نہیں کرتے ہیں، اسی لیے ان میں تجریدی طرز کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی بے معنی اور بے سود ہے۔ یہ ادیب بے ڈھنگ اور بے ربط جملوں کو فلسفہ کی سطح پر لا کر پیش کرتے ہیں۔

اینٹی تھیٹر کی تحریک اسی ذہنی پس منظر کی پروردہ ہے جس نے انگریزی میں "اینگری ینگ مین" کو جنم دیا۔ یہ نوجوان ادیب موجودہ سماج کے اقدار سے منحرف ہیں۔ وہ ایسے باغی ہیں جن کا کوئی آدرش نہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو صرف یہی محسوس کرتے ہیں کہ وہ آؤٹ سائڈر (بیرونی) ہیں۔ لیکن یہ سب برافروختہ نوجوان کسی ایک نقطۂ نظر کے پیرو نہیں۔ ان کا کوئی باقاعدہ منشور یا تنظیم نہیں۔ ان میں کچھ ادیب لیبر پارٹی کی اشتراکیت کے قائل ہیں۔ کچھ نے مذہبی احیا میں پناہ لی ہے۔ کچھ ... فوق البشر کی تشریح میں فلسفی بنے جا رہے ہیں لیکن وہ سب کے سب ایک نئی نسل کے نمائندے ہیں جو شکست خوردہ، دنیا تو ہی اور جلا وطن ہے۔ بیٹ نکس (BEAT NIKS) بھی زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ ہر طرح کے دنیاوی خیال اور روایتی اقدار کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فنا کی طرف گامزن دنیا میں انسان کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ حقیقت کو اس کی اصلی شکل میں پہچانا جائے، جب کہ وہ غم اور مسرت کے لمحات میں نظر آتی ہے۔ انسان تنہا ہے اور اس کے لیے ایک ہی راہِ نجات ہے یعنی یہ کہ وہ زندگی باشعور طور پر بسر کرے۔ انسان 'حال' ہی میں لمحہ بہ لمحہ جیتا ہے۔ اس کے باہر کوئی حقیقت نہیں۔ اسے اپنے حواس کو روشناس بنانا چاہیے تاکہ وہ اردگرد کی جیتی جاگتی زندگی کو پہچان سکے اور تجربہ کر سکے۔

حقیقت نگاری اور رومانیت یا فطرت نگاری، سماجی حقیقت نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری، سرریلزم اور شعور کا بہاؤ، علامت پرستی، فلسفۂ وجودیت، اینٹی تھیٹر، اینٹی ناول اور اینٹی اسٹوری۔ حقیقت نے ادب میں کتنے رنگ بدلے ہیں، اور حقیقت کی تلاش ہنوز جاری ہے اور شاید اسی تلاشِ مسلسل میں تخلیقی قوت کا راز مضمر ہے۔

(ایک مضمون سے اقتباس)

صفحہ ۴ سے آگے

لیکن اس قربت اور خصوصی تعلقات میں کتنی گہرائی اور حق تھا؟ اس کا جواب بشیر حسین کانپوری کی مندرجہ ذیل سطور ہی میں مل سکے گا۔

"ان شیخ صاحب (مولانا بدایونی) کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ راجہ میاں "سید نہیں تھے بلکہ شیخ تھے ان کا اسم گرامی "شیخ ممتاز احمد صاحب" تھا اور ان کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ غلام امام صاحب تھا.................." راجہ میاں صاحب" حضرت اکبر کی بہن کے شوہر نہیں تھے بلکہ ان کی بہن کے بیٹے تھے۔ حضرت اکبر کی حقیقی بہن "سیدہ علی باندی بی بی" کی شادی شیخ غلام امام صاحب کے ساتھ ہوئی تھی....

............جناب قمر صاحب (بدایونی) ۱۹۱۶ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں نام لکھوانے کے لیے تشریف لے گئے تھے ان کو اس کا اعتراف ہے کہ اس سے قبل اکبر کی خدمت میں ان کو کبھی حاضری کا موقع نہیں ملا تھا۔ بقول ان (بدایونی مولانا) کے شادی کی تجویز ۱۹۱۹ء میں کی گئی لیکن راجہ میاں کی صاحبزادی مقصود بی بی کی شادی ۹ نومبر ۱۹۱۵ء کو سید محمد عباس صاحب کے ساتھ ہوئی تھی جو حضرت اکبر کے چھوٹے بھائی سید اکبر حسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ مقصود بی بی کی بڑی بہن "محمدی بی بی" کی شادی ڈاکٹر محمد تقی صاحب کے ساتھ کئی سال قبل ہو چکی تھی۔"

(صفحہ ۵۵،۵۹۔ اکبر نمبر علی گڑھ میگزین)

مولانا بدایونی نے "بزم اکبر" کے اوراق میں دعویٰ کیا ہے کہ کم و بیش پانچ سال تک وہ اکبر کے افتخار ہم جلیسی اور ہم نشینی کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے اور فطری طور پر ان کو اکبر کے فن اور شخصیت سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ جو کچھ ان کے مطالعے اور مشاہدے میں آتا ایک خاص باقاعدگی کے ساتھ وہ اسے اپنی یادداشت میں قلمبند کر لیتے تھے مولانا بدایونی نے ان تعلقات کی گیرائی اور گہرائی کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس کے بعد سے جب میں شہر جاتا تھا سید صاحب (اکبر) سے ضرور ملتا تھا "عشرت منزل" میں ایک چھوٹا سا پائیں باغ سید صاحب شام کو اس میں بیٹھا کرتے تھے نماز باجماعت کا وہیں انتظام ہوتا تھا۔ آخر زمانے میں نماز جمعہ کو جامع مسجد جانا چھوڑ دیا تھا سیڑھیوں پر نہ چڑھ سکنے کا عذر پیش کرتے تھے۔ مولانا محمد کافی صاحب کے وعظ میں بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے میرے ذوق سخن سے واقف ہو کر میرے عشرت منزل پہنچتے ہی اشعار سنایا کرتے تھے۔ کبھی زبانی، کبھی بیاض دیکھ کر۔ بیاض اگر میز پر نہ ہوتی تھی تو اندر سے منگوائی جاتی تھی اور بتلاتے رہتے تھے کون اشعار کس پر کن حالات میں کہے ہیں مگر تاکید بار بار کرتے رہتے تھے کہ میری زندگی میں ان باتوں کو شائع نہ کرنا۔

جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا مجھ کو عزیز تر سمجھنے لگے ..............غرضیکہ یہ لطیف کن بات و نکات سمجھانے کے علاوہ اپنے خانگی افکار۔ بچی جھگڑے اور نجی خیالات سناتے رہتے تھے اور اپنا دل ہلکا کرتے تھے۔ آخر عمر میں لوگوں کی تواضع اور مدارات کرنے سے جان چرانے لگے تھے لیکن اس خصوص میں باوجود کافی محتاط ہونے کے میری تواضع کرتے رہتے تھے میں بھی ان کی مزاج داری۔ رازداری اور راحت رسانی میں حتی الوسع کمی نہیں کرتا تھا۔"

(صفحہ ۵۰، ۵۱۔ بزم اکبر)

لیکن اس تقرب خصوصی کے باوجود بے خبری کا یہ عالم کہ اکبر کی اولاد کے متعلق بھی انھیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ اکبر کی زوجہ اولی خدیجہ خاتون سے دو لڑکے تھے (۱) سید نذیر حسین عرف بدل میاں (۲) سید عابد حسین! مگر "بزم اکبر" میں (صفحہ ۲۶ پر) جو شجرہ دیا گیا ہے اس میں نذیر حسین کو لاولد بتایا گیا ہے اور ان کے صاحبزادے عاشق حسین کو عابد حسین کی اولاد میں شمار کیا گیا ہے۔ بشیر حسین کانپوری رقمطراز ہیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ نذیر حسین صاحب لاولد نہیں تھے بلکہ ان کے لڑکے کا نام عاشق حسین تھا جن کو عابد حسین کا لڑکا بتایا گیا ہے۔ دراصل عابد حسین لاولد تھے نہ کہ نذیر حسین۔ عشرت صاحب مرحوم کے دو لڑکوں کے نام غلط لکھے ہیں۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام سید محمد عقیل ہے۔ "حسین" کا اضافہ قمر صاحب نے غالباً اس رعایت سے فرما دیا!

ہے کہ وہ اکبر حسین کے پوتے ہیں۔ اسی طرح سب سے چھوٹے لڑکے کا نام سید سلیمان نہیں ہے (سلیمان حضرت اکبر کا نو عمر ملازم تھا۔"

(صفحہ ۷۵۔ اکبر نمبر علی گڑھ میگزین)

ایک طرف تو خانگی افکار کی جھگڑے اور مخفی خیالات سے اتنا گہرا رشتہ ہے! دوسری طرف کم آگاہی اور بے خبری کا یہ حال کہ خود اکبر کی اولاد کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ ان میں لاولد کون ہے؟ اور صاحب اولاد کون؟ ایک ایسے شخص کے لیے جو اپنے ہیرو کی شخصیت و سیرت پر کام کرنے کا ایسا جذبہ رکھتا ہو کہ اس کی زندگی میں یادداشتیں ترتیب دینا شروع کر دے۔ اور حالات زندگی لکھتے وقت اتنا تہی دست نظر آئے کہ سامنے کی چیزوں پر بھی اس کی نظر نہ ہو۔ تو اس کی تالیف کی اہمیت ظاہر ہے۔؟ اور ایسے "سیرت نگار" سے یہ شکوہ بھی بے سود ہے!

• (مولانا بدایونی (صفحہ ۲۴ "بزم اکبر) پر فرماتے ہیں کہ نذیر حسین عرف بدل میاں نوجوان تھے لیکن افکار و امراض کے باعث بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔ صورت پر پریشان حالی برستی تھی۔ کبھی کبھی مرگی کے دوروں سے گرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نذیر حسین صاحب پر مرگی کے دورے کبھی نہیں پڑتے تھے وہ چھریرے بدن کے خوش رو جوان تھے۔ ہاں عابد حسین پر مرگی کے دورے پڑتے تھے مگر وہ بھی خوش بشرہ اور تندرست تھے۔

(صفحہ ۸۰-۸۰۔ اکبر نمبر علی گڑھ میگزین)

اسی طرح برسہا برس اکبر کی خلوتوں اور جلوتوں میں شرکت کے باوجود یہ مشاہدہ۔ جو ۱۹۱۶ء کی پہلی ملاقات سے تعلق رکھتا ہے۔

"میں سوچا کرتا تھا کہ اکبر ایک خوش پوش۔ بھاری بھر کم منڈی داڑھی اور وجیہہ صورت کے جج ہوں گے۔ دیکھا تو ایک کمزور نحیف۔ سوکھی گردن۔ چھوٹے سر دبے ہوئے سینے۔ فکر زدہ چہرے اور کچھڑی داڑھی کے ایک صاحب ایک خانہ ساز چوگوشیہ ٹوپی لگائے کرسی پر "خمیدہ پشت" بیٹھے ہیں۔

(صفحہ ۲۰۔ بزم اکبر)

بچپن۔ جوانی۔ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی چار تصویریں اکبر نمبر میں موجود ہیں۔ اور اکبر کے دیکھنے والے ہند و پاک میں سو پچاس تو ابھی موجود بھی ہوں گے۔ لیکن شاید ان میں سے ایک بھی اکبر کے "کوزہ پشت" یا "کبڑے" ہونے کی تصدیق نہ کر سکے یا سید بشیر حسین اگر اکبر کے خاص عزیز نہ بھی ہوں تب بھی ان کے ایسے قریب ترین دوست یا دیکھنے والے ضرور تھے جن کا تردیدی بیان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"حیرت ہے کہ اس نوجوان طالب علم (مولانا بدایونی) نے اکبر کو "خمیدہ پشت" کیونکر لکھا؟ اکبر مرحوم کو دیکھنے والے اب تک ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں وہ سب گواہی دیں گے کہ اکبر مرتے مرتے کبھی "خمیدہ پشت" نہیں ہوئے وہ نحیف الجثہ ضرور تھے مگر ورزش کا شوق تھا مگدر ہلاتے تھے آخر عمر تک تن کر چلتے تھے۔"

(صفحہ ۵۹۔ اکبر نمبر)

اکبر کے فن اور شخصیت پر اب سے پچیس برس پہلے کوئی مستقل اور قابل ذکر کام نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انجمن ترقی اردو" کے اشاعتی پروگرام میں "بزم اکبر" کو بھی جگہ دے دی گئی تھی ورنہ اس کی تہی دامانی" افسوس ناک حد تک قابل توجہ ہے اور بعض مقامات پر تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فاضل مولف اصل کردار کو تاریکی میں چھوڑ کر اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے فکر میں مصروف و منہمک ہیں۔

چند ماہ ہوئے محب مکرم جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے اطلاع دی تھی کہ جناب مولوی قمرالدین احمد (مولف بزم اکبر) اکبر الہ آبادی پر کام کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع یقیناً ایک خوش کن خبر کا درجہ رکھتی ہے اور مولانا بدایونی جیسے بزرگ سے توقع ہے کہ وہ اپنی اس جدید تالیف میں "بزم اکبر" کی ان تمام فروگذاشتوں کا ذخیرہ کر دیں گے جن کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

---

مراسلات

# واجد علی شاہ کی تصنیفات

واجد علی شاہ اختر کی تصنیفات کی تعداد سو سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "بنی" (مسمی بہ بنی) میں جس کا سن تصنیف ۱۸۷۷ء اور سن طباعت ۱۸۷۸ء ہے، صفحہ ۲۴۲ سے صفحہ ۲۴۳ تک میں اپنی تصنیفات کی ایک فہرست دی ہے جس میں چھیالیس کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ ۱۔ اختر ملک ۲۔ خزانۂ عشق ۳۔ ارشاد خاقانی ۴۔ ایمان ۵۔ بحر الہدایت ۶۔ بحر العشق ۷۔ بحر مختلف ۸۔ بنی ۹۔ تاریخ مذہب ۱۰۔ تاریخ ممتاز ۱۱۔ تاریخ خاص ۱۲۔ تاریخ فراق ۱۳۔ تاریخ شغلہ ۱۴۔ تاریخ غزالہ ۱۵۔ تاریخ نور ۱۶۔ تاریخ جمشیدی ۱۷۔ تاریخ دہر ۱۸۔ تجلی عشق ۱۹۔ جوہر عروض ۲۰۔ حزن اختری (جو حزن اختر کے نام سے مشہور ہے) ۲۱۔ دریائے تعشق ۲۲۔ دستور واجدیہ ۲۳۔ دفتر ہمایوں ۲۴۔ دیوان مبارک ۲۵۔ دفتر پریشاں ۲۶۔ دلہن ۲۷۔ سخن اشرف ۲۸۔ شیوع فیض ۲۹۔ صحیفۂ سلطانی ۳۰۔ صوت المبارک ۳۱۔ عشق نامہ ۳۲۔ قر مضمون ۳۳۔ کلیات اختری ۳۴۔ کلیات سوم ۳۵۔ گلدستۂ عاشقاں ۳۶۔ مسودات مرثیہ ۳۷۔ ماہی نامہ ۳۸۔ مرقع فرخ ۳۹۔ مباحثہ بین النفس والعقل ۴۰۔ ناجو ۴۱۔ نظم ناموری ۴۲۔ نصائح اختری ۴۳۔ ہیئت حیدری ۴۴۔ ہمت ہفت زبان کہ وہ ابھی ناتمام ہے۔ ۴۵۔ پانچ چار کتابیں مراثی اور مصائب منظوم شہدائے کربلا ۴۶۔ مجموعۂ واجدیہ۔ اس کے بعد یہ عبارت ہے۔

"یہ سب فقیر کے کتب خانے میں موجود ہیں اور جو تنزل سلطنت اور غارت بدمعاشاں میں تاراج ہوگئیں وہ خارج از حساب ہیں" لیکن ان کتابوں کا پتہ نہیں چلتا۔ بنی کی تصنیف کے بعد واجد علی شاہ چند سال اور زندہ رہے۔ اس درمیان میں بھی اور کتابیں لکھی ہوں گی۔ اگر بقیہ کتابوں کے نام بھی جن حضرات کو معلوم ہوں لکھ دیں اور یہ بھی نشان دہی کر سکیں کہ وہ کہاں ہیں تو واجد علی شاہ پر کام کرنے والوں کی مدد ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ان کی چند اہم تصنیفات کی بحث۔ الہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں اختر کی حسب ذیل کتابیں موجود ہیں۔

۱۔ اختر ملک ۲۔ دریائے تعشق ۳۔ بحر العشق ۴۔ حزن اختر (واجد علی شاہ نے خود اس کا نام حزن اختری لکھا ہے) ۵۔ ناجو ۶۔ بنی ۷۔ دیوان اول، دوم و سوم ۸۔ کچھ مرثیے ۹۔ خاقان سرور انتخاب ولی جان عاصی ۱۰۔ معجزۂ منظوم (چالیس شعر کی مثنوی جس میں حضرت علی کے ایک مردہ عورت کو زندہ کر دینے کا معجزہ نظم کیا گیا ہے)

(سید محمد عقیل الہ آباد یونیورسٹی)

# اردو ٹیچرس ٹریننگ کا مسئلہ

اردو ہندوستان میں زوال کی طرف مائل ہے اس کا احساس سب کو ہو رہا ہے اس کے لیے سب سے ضروری ہے کہ اردو تعلیم کا زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔ ابتدائی تعلیم میں جدید طریقوں سے نفسیات کی روشنی میں تجربات کیے جائیں ان کی روشنی میں کتابیں مرتب کی جائیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ٹیچرس کی ٹریننگ ہو اور اردو تعلیم کے سلسلے میں سیمنار منعقد کیے جائیں۔ یہ سب کام "اردو انسٹی ٹیوٹ" کے اہتمام ہو سکتا ہے۔ ایسا انسٹی ٹیوٹ مسلم یونیورسٹی کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں کھل سکتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا حق اور فرض ہے اردو کی خدمت کرنا اتر پردیش کا محکمۂ تعلیم اردو ٹیچرس کی ٹریننگ کا انتظام کرتا تھا مگر آزادی کے بعد سے یہ انتظام ختم کر دیا گیا، سہ لسانی فارمولے سے اردو کے لیے گنجائش جو نکلی تو یہ احساس پیدا ہوا کہ اردو کے ٹرینڈ ٹیچرس نہیں ہیں اس سے بچوں میں اردو تعلیم کا ذوق و شوق پیدا نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے۔

تھوڑا عرصہ ہوا وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے فرمایا تھا کہ محکمہ تعلیم نے پانچ سو اردو جاننے والے ٹیچر بھرتی کیے ہیں۔ کچھ پرانے ٹیچر بھی ہیں اس طرح یقیناً یو۔ پی کے محکمہ تعلیم میں کافی تعداد اردو جاننے والوں کی ہو جاتی ہے اگر انجمن ترقی اردو جدوجہد کرے تو گورنمنٹ نارمل اسکولوں میں اردو ٹریننگ کا انتظام ہو سکتا ہے۔

رامپور کا مدرسہ عالیہ جو اب گورنمنٹ اورینٹل کالج کہلاتا ہے ریاست مرحوم (ضم) کے بعد اتر پردیش کے محکمہ تعلیم کے انتظام میں آگیا ہے۔ اس میں درجہ آٹھ تک اردو میڈیم سے تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں بہت آسانی کے ساتھ اردو ٹریننگ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ محکمہ تعلیم وہاں ایک ٹریننگ یونٹ قائم کر دے۔ تین یا چار ٹیچروں کا اضافہ مقرر کر دے۔ نہایت عمدہ طریقے سے ٹریننگ کا انتظام ہو جائے گا۔ محکمہ تعلیم میں ایسے اردو ٹیچرس بھی ہیں جو بی۔ ٹی اور ایل۔ ٹی ڈگری رکھتے ہیں۔ آرٹس سائنس اور مختلف کریفٹ کی بھی تعلیم دے سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے بی۔ اے میں ایجوکیشن کا مضمون رہا ہے۔ لہٰذا ٹریننگ کے انتظام میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوگی۔

اردو کے ہمدرد اور انجمن ترقی اردو اگر جدوجہد کرے تو ممکن ہے اردو ٹیچرس ٹریننگ کا مسئلہ حل ہوسکے۔

(شریف الحسن لاہرپوری)

## اغلباً یا اغلب

"ہماری زبان" مورخہ ۸؍ جنوری ۱۹۹۶ء کے آٹھویں صفحے پر "مراسلات" کے ضمن میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ کے ایک ذمہ دار شخص نے اپنے مضمون میں دو جگہ پر اغلباً کا استعمال کیا ہے۔ یوں میں ذاتی طور پر ان کی خدمت میں عریضہ بھیج دیتا کہ آئندہ خیال رکھیں لیکن اس احترام کے پیش نظر جو ان کی اردو پرستی کے ضمن میں مجھے حاصل ہے میں چاہتا ہوں کہ "ہماری زبان" کے دوسرے قارئین پر بھی واضح کر سکوں کہ غالباً کی جگہ پر اغلباً لکھ دینا نادرست ہے۔ اغلب عربی زبان میں افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور جہاں تک میرا علم رہنمائی کرتا ہے اس پر تنوین کا حق جائز نہیں ہے اگر انجمن کی شاخ کے یہ جنرل سکریٹری صاحب "اغلب ہے" لکھ دیتے تو محل شکایت نہ رہتا۔ اغلباً اس سے پہلے مجھے دہلی کے ایک علمی پرچہ میں بھی نظر آیا تھا اور میں نے ان کو بھی لکھ دیا تھا کہ اردو زبان کو مبتذل کرنے کی کوشش نہ کریں۔

(آغا خلش کاشمیری)

## اختر شیرانی کا "اختر"

جناب نادم سیتاپوری نے اختر شیرانی کے نام سے صرف چار رسالوں کی وابستگی کا اظہار کیا بہارستان، انتخاب، رومان، اور سہیلی (ہماری زبان مورخہ ۲۲؍ مئی ۱۹۹۵ء) پھر رحیم مینائی بنگلوری صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ خیابان اور شاہکار سے بھی اختر شیرانی کا تعلق رہا ہے (ہماری زبان مورخہ ۱۵؍ اکتوبر ۹۵ء) اب مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ مندرجہ بالا رسالوں سے تعلق اور وابستگی کے ساتھ اختر شیرانی نے ۱۹۳۳ء میں ایک رسالہ "اختر" نام سے جاری کیا تھا مدیر اعزازی اور معاون کی حیثیت سے محمد حسن بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی اور محمد عمر فاروقی ایم۔ اے تھے۔ اور سالانہ چندہ دو روپے چار آنے تھا۔

چونکہ "اختر" کا کوئی شمارہ میرے پیش نظر نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو" اورنگ آباد کے اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں تبصرہ کے کالم میں "اختر" پر بھی ریویو ہے جو بجنسہ نقل ہے:۔

اختر۔ ماہانہ دار الادب ہند، میکلوڈ روڈ لاہور سالانہ چندہ دو روپیہ چار آنے؛ یہ لاہور سے ایک نیا رسالہ جاری ہوا ہے۔ اس کے مرتب کرنے والے اختر شیرانی میاں محمد حسن بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، محمد عمر فاروقی ایم۔ اے ہیں۔ یہ اردو ادب و شعر کا ماہانہ مخزن ہے اور فی الحقیقت اسم بامسمٰی ہے یہ نوجوانوں کا رسالہ ہے۔ اس کی تمہید (جو لمعات کے نام سے تحریر کی گئی ہے) پڑھ کر ہمیں

بہت خوش ہوا کہ نوجوان اب فرسودہ روایات اور رواج کی تاب نہیں لا سکتے، وہ اردو ادب میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور تقلید کے پھندوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن مضامین دیکھنے کے بعد اس کی تصدیق نہ ہوئی۔ شاید آیندہ وہ اردو ادب کے پرانے کھنڈروں کو ڈھا کر نئی تعمیر کی بنیاد ڈالیں۔ رسالہ بیشک دلچسپ ہے لکھنے والوں کو ذمہ داری کا احساس ہے۔ شروع میں سر محمد اقبال کی ایک چھوٹی سی اردو نظم ہے جو بطور تبرک کے درج کی گئی ہے۔ پروفیسر شیرانی صاحب اسی رسالہ میں شاعر اور شکاری کی حیثیت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس کا بہت کم صاحبوں کو علم ہوگا کہ جیسے وہ زبردست نقاد اور ادیب ہیں ویسے ہی زبردست شکاری بھی ہیں۔ "حکایات شکار" کے نام سے ان کا مضمون ان کی ضخیم کتاب کا ایک باب ہے۔ یہ محض دل لگی کی باتیں نہیں ہیں بلکہ تاریخی تحقیق کے نتیجے ہیں۔ سستے کم چندے میں بہترین رسالہ ہے۔"

(مناظر عاشق ہرگانوی)

---

# فارم ۱۷

دیکھو رول ۸

## اخبار ہماری زبان

علی گڑھ

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | مقام اشاعت | سلطان جہاں منزل علی گڑھ |
| ۲۔ | وقفیت اشاعت | ہفتہ وار |
| ۳۔ | نام پرنٹر | ضمیر الدین قریشی |
| | قومیت | ہندوستانی |
| | پتہ | مسلم ایجوکیشنل پریس محلہ نبی اسرائیلیان علی گڑھ |
| ۴۔ | نام پبلشر | نذیر حسن |
| | قومیت | ہندوستانی |
| | پتہ | انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ |
| ۵۔ | نام ایڈیٹر | پروفیسر آل احمد سرور |
| | قومیت | ہندوستانی |
| | پتہ | شبلی روڈ علی گڑھ |
| ۶۔ | نام پتہ مالک اخبار | انجمن ترقی اردو ہند سلطان جہاں منزل علی گڑھ |

میں نذیر حسن تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم / مارچ ۱۹۹۶ء نذیر حسن

# انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کے زیر اہتمام

## یوم غالب

دہلی ۲۰ رفروری۔ گذشتہ روز انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی طرف سے یوم غالب کی تقریبات کو نہایت اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ راجدھانی کے ادیبوں، شاعروں، تعلیمی اداروں کے اردو شعبوں کے ذمہ داروں اور سینکڑوں کی تعداد میں دوسرے ادب دوستوں اور محبان اردو نے ان تقریبات میں شرکت کی

پروگرام کی ابتدا مزار غالب پر گل افشانی سے ہوئی۔ اس رسم کی ادائیگی کے بعد مزار غالب کے احاطہ میں ہی ابتدائی نشست ہوئی جس میں ہندوستان کے مشہور موسیقاروں نے غالب کی غزلیں پڑھیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ اس موقع پر مزار غالب پر چراغاں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

یوم غالب کی بزم مقالات اور بزم مشاعرہ کا انعقاد مزار غالب کے قریب واقع عرس محل کے عظیم الشان اور وسیع ہال میں عمل میں آیا۔

بزم مقالات کی صدارت جناب ڈاکٹر یوسف حسین صاحب نے فرمائی۔ انجمن ترقی اردو کے صدر پنڈت سندر لال نے صدر محترم اور سامعین حضرات کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر صاحب موصوف کو رسمی طور پر متعارف کرایا۔

جناب گوپی ناتھ امن صاحب نے غالب اور آزاد کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ مقابلتاً یہ ایک نیا موضوع تھا۔ بزم میں اس مقالہ کو دلچسپی کے ساتھ سنا گیا۔ امن صاحب کے بعد دلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنا مقالہ پڑھا۔ خواجہ صاحب نے اس مقالہ میں کلام غالب کی علمی و ادبی حیثیت سے بحث فرمائی غالب کی نثر و نظم پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مقالہ کے بعد بیگم انیس قدوائی ممبر پارلیمنٹ نے ایک خاکہ پیش کیا۔ بیگم انیس قدوائی صاحبہ کا طرز تحریر بڑی حد تک منفرد ہے۔ اس مقالہ کو حاضرین نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ بزم مقالات کا سلسلہ ساڑھے تین بجے سے چھ بجے تک جاری رہا۔ اس تمام عرصہ میں سامعین کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ لوگ آخر تک دلچسپی کے ساتھ مقالات کو سنتے رہے۔ ابتدا میں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر جناب مائل ہردوی (ہرات) نے غالب کی ایک فارسی غزل پر تضمین پیش کی اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی نے غالب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے انداز و فکر کو بہترین الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ غالب کے تصور حیات کے مختلف پہلوؤں پر ان کے اشعار کی روشنی میں بحث فرمائی آخر میں ڈاکٹر صاحب نے غزل کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا اور کہا کہ دنیا کے چھوٹے بڑے ملکوں کی زبانوں میں غزل کا تصور موجود ہے اور ان سبھی زبانوں میں غزل کے خدوخال وہی ہیں جو اردو غزل کے ہیں۔

بزم مقالات کے بعد بزم مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ درمیان میں نصف گھنٹے کا وقفہ چائے وغیرہ کے لیے مخصوص تھا بزم مشاعرہ کی صدارت دلی کے میئر جناب نور الدین احمد نے فرمائی۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں انجمن ترقی اردو کو یوم غالب کے اس پروگرام کے لیے مبارکباد دی اور بہترین الفاظ میں غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

مشاعرہ کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہندوستان کے مشہور ماہرین فن موسیقی نے غالب کی غزلیں پڑھیں۔

بزم مشاعرہ شب میں دس بجے تک جاری رہی۔ بہار برنی نے ناظم کانفرنس کے فرائض انجام دیے۔ جن شعراء کرام نے مشاعرہ کی کامیابی میں حصہ لیا ان میں گلزار بخش صدیقی، مولانا انور صابری، کامل نظامی دہلوی، طالب دہلوی، خار دہلوی، یادگار رسائل، شوق نگینوی، رفعت سروش، بشیر جھنجھانوی، رام کشن مضطر، بہار برنی، انوار علی خاں سوز، ظفر ادیب، ضیا فتح آبادی، پریم شنکر فرحت نقوی سکندر آبادی، ہیرا لال فلک، انور چشتی بنگلوری، محمد اقبال اقبال، چمن دہلوی اور کئی دوسرے حضرات نے حصہ لیا۔ مولانا انور صابری نے غالب کو ایک نہایت خوبصورت اور مرصع نظم میں خراج عقیدت پیش کیا۔ بہار برنی نے صدر مشاعرہ، شعراء اور سامعین کا انجمن ترقی اردو کے عہدہ داروں اور اراکین کی طرف سے شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ رنگا رنگ بزم اختتام پذیر ہوئی اور بڑی تعداد میں اہل سخن اور دوسرے حضرات نے انجمن کی جنرل سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان اور دوسرے کارکنوں کو اس کامیاب پروگرام کے لیے مبارکباد دی۔

(الجمعیۃ)

---

## تصحیح

مضمون "عشق نامہ" مطبوعہ "ہماری زبان" مورخہ ایک، آٹھ اور پندرہ فروری سنہ ۷۲ء میں جہاں جہاں گذشتہ ہفتہ کا ہماری زبان لکھا ہے اس سے مراد ۱۵ رجنوری سنہ ۷۲ء کا ہماری زبان ہے دوسری قسط مطبوعہ ۸ رفروری سنہ ۷۲ء میں صفحہ ۴ کالم ۲ (فٹ نوٹ) مطبع سبحانی کے بجائے مطبع مسیحائی پڑھا جائے۔

اور صفحہ ۷ کالم ۲ کا یہ مصرع تھا

چرچا ہے پڑھے عشق نامہ کا حال

"چرچا ہے پڑھے عشق نامہ میں حال" پڑھا جائے۔

(ادارہ)

# حیدر آباد کی مختلف ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام

## جلسۂ عام

حسب ذیل قرارداد حلقۂ فکر و نظر حیدر آباد و دیگر ۲۴ ادبی و تہذیبی انجمنوں کی جانب سے منعقدہ جلسۂ عام میں متفقہ طور پر منظور کی گئی جو ۵ر فروری ۶۶ء کو ۸ بجے شب بمقام مغلپورہ چوراہا زیر صدارت جناب مخدوم محی الدین صاحب منایا گیا۔

قرارداد

شہر حیدر آباد کی مختلف ادبی و تہذیبی انجمنوں، اردو کے کارکنوں اور ہمدردوں کا یہ جلسہ اس مسودۂ قانون کا خیر مقدم کرتا ہے جو تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے اسمبلی کی آیندہ میقات میں پیش کیا جانے والا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک صحیح اقدام ہے۔

یہ جلسہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ اردو کے استعمال کے لیے بھی مجوزہ قانون میں ضروری دفعات شامل کی جائیں جس سے آندھرا پردیش کی سب سے بڑی لسانی اقلیت کے واجبی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ جو ۳۰ لاکھ سے زائد اردو مادری زبان اور اس سے کئی گنا زیادہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی آبادی پر مشتمل ہے۔

انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) نے اس تعلق سے جو مانگ کی ہے اور اردو کو قانونی موقف دینے کے لیے مسودۂ قانون میں جو ترمیمات پیش کی ہیں ان کی بھی یہ جلسہ پر زور تائید کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ریاست آندھرا پردیش میں اردو کے موقف کو قانونی طور پر محفوظ کر دیا جائے۔

دستخط (مخدوم محی الدین)

صدر جلسہ

مندرجہ ذیل انجمنوں کے صدور و معتمدین نے اس قرارداد پر دستخط کیے ہیں۔

۱۔ مرکزی حلقۂ فکر و نظر حیدر آباد۔ ۲۔ دار المطالعہ و کتب خانۂ عام (انجمن ترقی)۔ ۳۔ لیگ آف ڈیموکریٹک یوتھ مغلپورہ (اردو) مغلپورہ۔ ۴۔ اردو گلڈ۔ ۵۔ بزم ہیکش۔ ۶۔ بزم طلبہ نظامیہ طبی کالج حیدر آباد۔ ۷۔ بالی اسٹڈی سرکل۔ ۸۔ انجمن تعمیر ادب۔ ۹۔ بھارت جن درد کا سنستھا۔ ۱۰۔ ینگ مینس اسوسی ایشن گولی پورہ۔ ۱۱۔ انجمن مصنفین عثمانیہ۔ ۱۲۔ صفی سوسائٹی۔ ۱۳۔ مجلس رفیقان ادب۔ ۱۴۔ ادبستان صفی۔ ۱۵۔ بزم تحسین ادب۔ ۱۶۔ بزم بانی۔ ۱۷۔ ہندو مسلم یونائیٹڈ فرنٹ۔ ۱۸۔ بزم واجد کامل۔ ۱۹۔ انجمن شعور ادب۔ ۲۰۔ انجمن گلزار ادب۔ ۲۱۔ انجمن تہذیب و ادب۔ ۲۲۔ زور اردو اکیڈیمی حیدر آباد۔ ۲۳۔ اسٹوڈنٹس لبرل کانگریس۔ ۲۴۔ بین الکلیاتی اردو سوسائٹی جامعہ عثمانیہ۔ ۲۵۔ عوامی ادبی سوسائٹی۔

(بشیر اللہ مسعود عثمانی)

# الہ آباد یونیورسٹی میں یوم غالب

اردو ایسوسی ایشن شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۷ر فروری ۱۹۶۶ء کو ۳ بجے سہ پہر اورینٹل ہال میں یوم غالب کی تقریب منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر سید احتشام حسین صدر اردو نے فرمائی۔ جلسے کا آغاز غالب کی غزل ؎

کوئی دن گر زندگی اور ہے۔ جسے ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب نے اپنے مخصوص مترنم انداز میں پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر رفیق صاحب نے غالب کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ غالب ہمارے محبوب شاعر ہیں۔ ان کا کلام ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ بعد ازاں غالب کے چند خطوط ڈرامائی انداز میں عطیہ نشاط خاں اور نجمہ زماں ایم۔ اے کی طالبات نے پیش کیے۔ راجہ مہدی علی خاں کی چند پیروڈیاں نسیم بانو اور جلیس بیگم نے پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے "غالب ایک مختصر مطالعہ" کے عنوان سے ایک پر مغز مقالہ پڑھا۔ جس میں پروفیسر موصوف نے غالب کی شاعری پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔ غالب کے انٹرویو کے عنوان سے ایک اسکٹ محمد حسین نقوی اور رئیس نواب صاحبان نے اسٹیج کیا۔ اسکٹ اردو کے مشہور شاعر نریش کمار شاد کا لکھا ہوا تھا۔ اس مختصر سے ڈرامہ کو ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ آخر میں شعبۂ ہندی کے ایک طالب علم چندر پرکاش نے غالب کی غزل

"نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے" بڑے پر اثر انداز میں سنا کر جلسہ سے خوب خراج تحسین وصول کیا۔

اپنی اختتامیہ تقریر میں پروفیسر احتشام حسین صاحب نے کارکنانِ یوم غالب اور شعبہ کے اساتذہ کو اس پروگرام کے لیے مبارکباد دی۔ شکریہ کے فرائض قمر عباس سکریٹری اردو ایسوسی ایشن نے ادا کیے۔

(قمر عباس سکریٹری)

# کروڑی مل کالج دہلی کے زیر اہتمام شام غالب

۱۹ر فروری ۱۹۶۶ء کو کروڑی مل کالج دلی یونیورسٹی میں "شام غالب" منائی گئی۔ پرنسپل سنگت رام نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم ایک انوکھا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ اسٹیج کے ذریعہ غالب کو ان لوگوں تک پہنچایا جائے جو غالب سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اردو رسم الخط سے واقف نہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے تقریب کا افتتاح کرتے

ہوئے غالب کی شخصیت اور شاعری پر ایک مختصر لیکن انتہائی جامع اور دلچسپ تقریر کی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ "مرزا غالب" اسٹیج کیا گیا۔ کالج کے طلبہ اور طالبات نے غالب کی غزلیں گائیں اور آخر میں غالب کے قطعے

"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" پر ٹیبلو پیش کیا گیا۔

تقریب کے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر سردیب سنگھ، صدر شعبہ انگریزی دلی یونیورسٹی نے اپنے تاثرات بیان کیے۔

(سکریٹری بزم ادب)

## میسور میں پروفیسر آل احمد سرور کا استقبال

میسور ۱۷؍ فروری ۷۶ء

کل شام پانچ بجے یہاں سینٹ فلومیناس کالج میسور کی انجمن اردو کا افتتاحیہ جلسہ منعقد ہوا۔

انجمن کے صدر جناب عبدالقادر ایم۔ اے نے معزز مہمان پروفیسر آل احمد سرور کا پُر خلوص استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ انجمن کے قیام کے پندرہ برسوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین ڈاکٹر عابد حسین جیسی بلند ہستیوں نے انجمن کو عزت بخشی ہے سرور صاحب کی آمد بزرگوں کے اس سلسلے کی کڑی میں اضافہ ہے۔

محترم سرور صاحب نے موجودہ سائنسی دور میں ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی جب تک خالص سائنس کے پروانوں کو، ادب کی روشنی نہیں مل پاتی انسانیت کی ساری بلند قدریں فنا کے راستے پر ہیں۔ ان حالات میں طالب علموں کا رول بہت اہم ہو جاتا ہے۔

پرنسپل بن ٹی تھامس کی صدارتی تقریر اور شکریے کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

(ام ان سعید)

## انجمن ترقی اردو (جمنا پار) دلی کی ایک میٹنگ

انجمن ترقی اردو (جمنا پار) دلی کی ادبی نشست زیر صدارت جناب لالہ جے نرائن سکون منڈی شاہدرہ میں منعقد ہوئی۔ سب سے پہلے ہری نند دل پروانہ، علامہ زار زتشی، پروفیسر ملوک چند محروم اور شری لال بہادر شاستری کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ جناب پروانہ کی جگہ انجمن ہذا کے نائب صدر قدیر احمد چودھری لائبریرین نہرو لائبریری شاہدرہ کو صدر چنا گیا۔ جناب شائق برتپوری کو نائب صدر اور خرد صاحب کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ بعدہ ایک مختصر مشاعرہ کا دور چلا جس میں جناب شائق، خرد، سکون، زلفی، شرما، آرزو، چندن روشن، قدیر احمد وغیرہ نے اپنا کلام سنایا اور ایک بجے مجلس برخاست ہوئی۔

(قدیر احمد)

## بزم اردو آگرہ کالج کا سالانہ جلسہ

تعلیمی سال کے اختتام پر دستور کے مطابق آگرہ کالج کی بزم اردو کی جانب سے ۱۱؍ فروری کی شام کو ایک جلسہ گنگا دھر شاستری بھون آگرہ کالج میں منعقد کیا گیا۔ پروفیسر گھنشیام استھانہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے جناب سبین فریدی سے جلسہ کو ترتیب دینے کی درخواست کی جناب فریدی نے مختصر سی تقریر میں اپنے مہمانِ خصوصی جناب ایس۔ این سنہا کا تعارف پیش کیا اور ان سے صدارت کی درخواست کی۔ سنہا صاحب نے اپنی تقریر میں اردو غزل کی اہمیت اور اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالی نورالدین نے اپنی رپورٹ میں بزم اردو کا سال بھر کا جائزہ پیش کیا۔ شعراء نے کلام سنایا اور عصرانہ دیا گیا۔

(نورالدین
سکریٹری بزم اردو)

---

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔



مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے لیے پرنٹر ضیاء الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور نذیر حسن پبلشر نے مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا